تعارف

طلعت عرفانی

10621
31.3.90

GIFTED BY
RAJA RAM MOHAN ROY
Foundation

10621
31.3.90

تعارف

(ताआरुफ़ / पहचान)

یہ کتاب مغربی پاکستان اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی جا رہی ہے

10621
31. 3.9

اِنتساب

اپنے والد

کے

© طلعت عرفانی
۸۷/ای، ریلوے کالونی
روہتک (ہریانہ)

پہلی بار دسمبر ۱۹۸۸ء
کتابت جمال گیاوی
طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی
سرورق زرّاق ارشد

قیمت : چالیس روپے

زیر اہتمام :
پریم گوپال متل

10621
31:3:90

پیش لفظ

ہریانہ کے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ہریانہ اُردو اکادمی نے کئی اہم منصوبے بنائے ہیں —— ان منصوبوں میں ادیبوں اور شاعروں کے مسودات کی اشاعت کے لیے معقول مالی تعاون دینا بھی شامل ہے۔ سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے اکادمی جن ادیبوں اور شاعروں کو یہ تعاون دے رہی ہے اُن میں طلعت عزفانی بھی شامل ہیں۔

جناب طلعت عزفانی ہریانہ کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی فکر میں [illegible] ہیں اور ادب کے عصری ماحول کا رکھ رکھاؤ بھی۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام [illegible] کے افکار و اظہار کا ترجمان ہے۔

[illegible] کے اس کلام کو قدر کی نگاہ سے [illegible] پذیرائی ہوگی۔

لال ڈاکٹر
سیکرٹری
اکادمی، پنچکولہ

اظہارِ تشکر

تعمیرِ ہریانہ ——— چنڈی
پاسبان ——— چنڈی
تحریک ——— دہلی
معلمِ اردو ——— لکھنؤ
ستارہ ——— لاہور
فکر و فن ——— شملہ
اور
آل انڈیا ریڈیو ——— روہتک

حمد اور دعا

ترا ہی سب نام ہے مرا ایک تو ہی تو ہے
مَیں کچھ نہیں ہوں نہ کوئی ہونے کی آرزو ہے

بدن کی مٹی میں ہے لہو کے خمیر میں ہے
تو چھپ کے بیٹھا ہوا ہمارے ضمیر میں ہے
تری عبادت سے تیرے بندوں میں نیک خو ہے

ترے اشارے پہ ہفت افلاک چل رہے ہیں
ترے ہی پرتو سے لاکھ سورج پگھل رہے ہیں
تجھی سے ہر شے کو عالمِ ہوش میں نمو ہے

ترا تبسم گلوں پہ شبنم اُتارتا ہے
تو ہر پرندے کو ہر افق سے پکارتا ہے
ترے کرم سے چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے

تو سب طرف ہے سبھی میں ہے اور کہیں نہیں ہے
ترے ہی دم سے لگی ہوئی عرش پر زمیں ہے
ترے تعلق سے آسمانوں کی آبرو ہے

مری سبھی خواہشوں پہ اپنی نگاہ رکھنا!
بھٹک بھی جاؤں تو لوٹ پانے کی راہ رکھنا!
یہی دعا ہے یہی ترے در سے آرزو ہے۔

اِنتظار

وہ سارے خُشک پتّے
جو ہمارے پاؤں کے نیچے کُچل کر،
چونک اُٹھتے تھے۔
مجھے اُن کی صدائیں نظم کرنے کے لیے کہہ کر
گجر دم کی گئیں۔ تم،
شام تک موسم زدہ اس باغ میں
واپس نہیں لوٹیں
تو میں
دن بھر کی یہ لکھی ہوئی نظمیں،
بھلا کس کو سُناؤں گا؟
کِسے کیسے بتاؤں گا؟
کہ موسم خشک پتوں کا نہیں
پھُولوں کی آمد ہے۔

ہماچل کی یاد

ہلکے نیلے رنگ کا
میرا نیا اونی پُل اوور
اور یہ سردی کا موسم

اِن دنوں جب پربتوں پر برف گرتی۔
تو جانے کیوں مجھے
بھیڑوں کے بچے یاد آتے ہیں
اور میری سوچ،
اُن بھیڑوں کی ننگی پیٹھ چھو کر لوٹتی ہے،
جن کے جسموں سے
ابھی تک اُون اُتاری جا رہی ہے۔

وہ چراگاہیں، کہاں ہوں گی؟
کہ جن میں، دُھند کے نیچے، سبھی کچھ،
سویا سویا جاگ رہا ہے
میں بھی اُن بھیڑوں کے بچوں میں سے
کوئی ایک ہوں،
جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے؟

تانا بانا

شور سناٹے کے بیجوں کو
زمیں پر روندتا ہے
اور کہتا ہے کہ "جاؤ!
جس طرح میں اس جگہ لایا گیا ہوں
تم بھی جا کر اپنی کوئی دوسری دُنیا بساؤ!"
اور سناٹا
زمیں کا درد سینے سے لگائے
لڑکھڑا کر ڈولتا ہے
کھردرے کمبل سے اک خاموش پیکر بولتا ہے۔
کُلبلتی آنکھیں۔
کہ جیسے زرد چہرہ پوچھتا ہو،
"شور بھائی!
ہم ترے کہنے پہ اپنا دھاگہ دھاگہ
ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔
بعد میں، لوگوں کو
لفظوں کی ضرورت آپڑی تو
تم اکیلے کیا کرو گے؟"

لفظ کی بنیاد

چُپ کی یہ کیفیت
صرف الفاظ، جیسے بھی، جو بھی
جہاں سے بھی آئیں، سُنیں!
اپنی آنکھوں کے نزدیک لاکر
انھیں دیکھ پائیں
کہیں سے ذرا چھُو سکیں۔

اور تب، ہم سے شاید
زمان و مکاں کے لیے
اک نیا لفظ ایجاد ہو
جو کہ آیندہ سوچوں کی بنیاد ہو۔
اور ممکن ہے
یہ بھی ہماری کوئی گمشدہ یاد ہو۔

وہی اک ربطِ باہم
تم کو مجھ سے، مجھ کو اس سے
اور اسے سب سے ملاتا ہے
یہ وہ دریا ہے، جو اکثر بیک لمحہ
ہزار اطراف لہراتے ہوئے
بہتا بہاتا ہے
لہٰذا! آج میں
اُس ربطِ باہم سا تمھارے سامنے ہوں
اور کہتا ہوں
کہ یوں بیمار آوازوں کے جنگل میں
تمھارا سُبگانا
کون سے حرفِ نوا کا نام پائے گا
وہ سب جوشِ نمو
جو دشتِ امکاں کی امانت ہے
اگر اپنی طبیعت سے ہٹا
تو بالیقیں، بے کار جائے گا
سنہری حرف کی جاگی ہوئی آہٹ کو پہچانا
تو میں تم کو
تمھاری شخصیت کے پار لے جاؤں!

سُنہری حرف

کبھی خود کو مکمل طور پر خالی اگر محسوس کر پاؤ
تو میں تم کو تمھاری شخصیت کے پار لے جاؤں
تمھاری شخصیت
جس نے تمھیں بیمار آوازوں کے جنگل میں
بھٹکنے کے لیے ہر دور میں مجبور سا پایا
مگر پھر بھی کہیں کچھ تھا
کہ جو تم کو بچا لایا
تمھاری شخصیت، دراصل
مٹی کا کھلونا ہے
جو اپنے آپ میں،
لذت کی لامحدود وسعت کو سمونا ہے
مگر پھر بھی، کہیں اک بوجھ ڈھونا ہے

کنول، کیچڑ
بظاہر دو الگ کیفیتیں ہیں ایک پانی کی
مگر تم نے کبھی اس کو بھی جانا ہے؟
کہ جس نے ہر قدم
دوری کی چھپ کر نگہبانی کی۔

کے سائے میں بُلاتا ہے
جو مندر کے شِکھر پر
آرتی کے تھال سا گنبد سے بے آویزاں

مجھے لگتا ہے
مَیں بھی آسماں کے سائے میں
اُس ڈوبتے سورج سا تنہا ہوں

تبھی چپکے سے کوئی کان میں آکر یہ کہتا ہے
"اُدھر دیکھو!
اُفق سے تا اُفق
صنّائیِ قدرت پر افشاں ہے
مگر جس موڑ پر تم ہو
وہیں دیوارِ زنداں ہے"

یہاں سے سر اُٹھا کر
آسماں کو دیکھنا اچھا تو لگتا ہے
مگر نیچے، جہاں مَیں ہوں

مگر نیچے جہاں میں ہوں

یہاں سے سر اُٹھا کر
آسماں کو دیکھنا اچھا تو لگتا ہے،
مگر نیچے جہاں میں ہوں
وہاں سے اور نیچے
کتنا کچھ کہر میں ڈوبا ہے
تمھارے آنسوؤں کی یاد میں
بھیگی ہوا پگڈنڈیوں سے لوٹ کر
مجھ سے لپٹتی ہے
تو میں یکلخت اُس مندر سے آتی
گھنٹیوں کے نادستا ہوں
جہاں، تپ، دھیان، پوجا، سادھنا، آرادھنا
آٹھوں پہر چلتے ہی رہتے ہیں

درختوں کا اکیلا جھنڈ
جو پربت کے ماتھے پر
تنک سا چھوٹا تب
مجھے سن ڈوبتے سورج

اَچھے لوگ

اکثر دیکھا ہے لوگوں کو
ہم سے بہت بڑے، لیکن
اپنی چھوٹی چھوٹی دُنیائیں پریم سے بھرے
بھوکے پیٹ
مگر اوروں کے لیے ہمیشہ کھاتے پیتے
ان کے مستک ایک اُجالا
دیکھا بھالا
دِل جیسے ہر سمت دوستی
ہاتھ پسارے بڑھتی آئے
ایسے لوگ نہ ہوں تو یہ دُنیا
ایک جہنم سی ہو جائے۔

ٹوٹے ستارے

چاند میں بیٹھی ہوئی
بڑھیا کا چرخہ چل رہا ہے
دھاگہ دھاگہ روشنی،
جن راستوں سے
آسماں کو جا رہی ہے،
یہ وہی ٹوٹے ستارے جانتے ہیں،
جن کے ہاتھوں کی لکیریں
آج بھی بڑھیا کی جیبوں میں پڑی ہیں
اور جن کی آرزوئیں
آسماں سے بھی بڑی ہیں

21
390

ہاں مگر معدوم ہیں جو
اپنے ہونے کا غلط مفہوم ہیں جو۔

مگر اب چند خالی کرسیاں
میزوں کے سینوں سے لگی آرام کرتی ہیں
یہ سب، ہر صبح اُٹھ کر
آنے والے گاہکوں کے نام پر نیتی سنورتی ہیں

مَیں کافی تھک چکا ہوں
اب جو تھوڑی دیر کو بتی چلی جائے
تو مجھ کو نیند آ جائے

مَیں آج آنکھوں میں
اُس بچے کی بھولی مسکراہٹ لے کے سوؤں گا
جو کل اس ریستراں میں
اپنی ماں کے ساتھ پہلی بار آیا تھا
میری آواز پر حیرت زدہ ہو کر
جب اس نے ماں سے کچھ پوچھا،
تو اس نے یوں بتایا تھا۔
کہ بیٹے۔ "آدمی کی سانس، روٹی کی مہک
سالن کی خوشبو اور سگریٹ کا دھواں
جب ریستراں میں اک طرح سے قید ہو جائیں
تو یہ پنکھا انھیں اپنے ذریعے کھینچ کر
تازہ ہوا کا راستہ ہموار کرتا ہے۔
یہ پنکھا جانتے ہو؟
آدمی سے پیار کرتا ہے۔"
یہ سُن کر بھول سے بچے کے چہرے پر

ایگزاسٹ فین

مَیں آوارہ طبیعت تو نہیں
لیکن، ہمیشہ اپنے محور پر
اکیلے گھومتے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا
یہاں تو یوں بھی چاروں اور
بس مکڑی کے جالے، دھول، مٹی، اور اندھیرا ہے
یہ چھوٹا سا دریچہ، جس کے اندر
ان سبھی کے ساتھ میں، برسوں سے زندہ ہوں
ہمارا سب کا مشترکہ بسیرا ہے

ادھر، باہر میرے مُنہ کی طرف آسمان کا شس کھلتا ہے
تو پیچھے، ایک بوڑھا رسیشراں
جو نت نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلتا ہے

وہ شاید سو رہا ہے
اور میری آواز سنتا کے یہ طاری ہے
مری آواز گویا سو رہے اجگر کے مُنہ سے سانس جاری ہے

ابھی کچھ دیر پہلے تک، وہاں سب روشنی
ہر میز پر لوگوں کا جمگھٹ تھا۔

ہچکیاں

ہم نشے میں، گالیاں بکتی ہوا سے لڑ رہے تھے
ہم نشے میں تھے۔ ہوا
جب گالیاں بکتی ہوئی گزری
تو ہم کھل کر ہنسے، ہنستے رہے
لیکن، تبھی تو نے
ہمارے نام سے ہم کو پکارا
ڈوبنے والے کے جیسے
ہاتھ پر لا کر کوئی رکھ دے کنارا۔
اور تب ہم
یک بیک، رونے لگے
روتے رہے، روتے رہے تھے
کیونکہ، جو باقی تھا، سب آنسو تھے
یا آنکھیں، کہ جو بھی
وہ تو تیرے نام کی بس ہچکیاں سی کھا رہا تھا
ہم کہیں باقی نہ تھے
اور تو ہمیں چھو کر، ہوا کے ساتھ
واپس جا رہا تھا۔

نہ جانے کون سے جنموں کی میٹھی مسکراہٹ
جاگ اُٹھی تھی۔
میرے دل میں بھی جس کو دیکھ کر
اک آگ اُٹھی تھی۔

اُسی اک آگ کی لَو میں،
مَیں اپنے آپ کو شاید کبھی پہچان پاؤں گا
مگر اس دُھول، مٹی اور اندھیرے سے
بھلا کب تک نبھاؤں گا؟
مَیں کافی تھک چکا ہُوں
اب جو تھوڑی دیر کو بتی چلی جائے
تو مجھ کو نیند آجائے

مجھے کل صبح
پھر تازہ ہوا کا راستہ ہموار کرنا ہے
کہ اس بچے کی میٹھی مسکراہٹ کے لیے
اس زندگی سے پیار کرنا ہے۔

داستانِ جہاد

میں نے دیکھا ہے
کہ پانی کے مخالف تیرنا
مچھلی کی مجبوری ہے
ورنہ، چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو
بہتے پانی کے سفر میں
عمر کا حاصل نہ ہو گوئی مقام
مرحبا! اے زیست کے دلکش خرام!
مرحبا! اے خواہشِ عمرِ دوام!

بازگشت

تمھاری شدّتِ احساس شاہد ہے
کہ جن الفاظ سے تم نے
ہمیں آ کر نوازا ہے
جب ان الفاظ کی موزونیت کا
حق ادا ہو گا
ہمارے عکس ہوں گے
اور تمھارا آئینہ ہو گا۔

حضور آبا نے ہم دونوں کی
ہر ضد کو نوازا اور تراشا ہے

پرانی ایک مسجد
اور تھوڑے فاصلے پر
ایک چھوٹا سا شوالہ ہے
انھیں سب کی بدولت
آدمی کا بول بالا ہے
یہاں ورنہ جو میلہ، سال میں
دو بار بھرتا ہے
نہ جانے کن بہانے قریبوں سے گزرتا ہے۔

سبھی کچھ مطمئن سا چل رہا ہے
پھر بھی لگتا ہے
کہیں کچھ لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں
کہیں چپ چاپ چلتے
اور کہیں اک دوسرے کے پاؤں پڑتے ہیں
مگر ہم ان سبھی سے
بے نیازانہ گزرتے ہیں۔
ہم اپنی خوش دلی کا
بھیڑ کے چہرے سے اندازہ لگاتے ہیں
کسی بھی آئینے کے سامنے
خود کو جھلک بھر دیکھتے ہیں، کھلکھلاتے ہیں

ہم کھلونے ا
ابا حضور کی انگلی

نئے کپڑے پہن کر، آج ہم
اس گاؤں کے میلے میں پہلی بار آئے ہیں
حضور ابا، ہمیں انگلی تھمائے ہیں
وہ پہلے سے ہمیں میلے کے بارے میں
بہت سمجھا کے لائے ہیں۔
ہم اُن کے حکم کی تعمیل میں تو ہیں
مگر پھر بھی شرارت، دائیں بائیں
ساتھ چلتی ہے
کبھی میں بھاگتا ہوں
اور کبھی چھوٹی بہن آگے نکلتی ہے۔

بہت سے لوگ ہیں
دنگل، تماشے، خوردنی اشیاء
ہزاروں طرح کی روزانہ استعمال کی چیزیں
مگر اپنے لیے تو
بس یہی دو چار دس
غبارہ کھلونوں کا تماشا ہے۔

میں بہت چھوٹا تھا شاید!
کچھ کہیں تھا بھی، کہ بس یونہی سا تھا میں؟
بارش آتی، اور ہم بچے
محلّوں سے نکل کر
بھیگتے، کلکاریاں بھرتے
گلی، بازار، چوراہوں کو پیچھے چھوڑتے
بھاگے چلے جاتے
کہ بارش میں، سب اس تالاب میں
مل کر نہائیں
ایک دوجے کو چھوئیں
پانی میں تیریں، چھپیچھپائیں

اب کئی دن بعد آیا ہوں، تو دیکھا ہے
یہاں سب کس قدر بدلا ہوا ہے
اب یہاں دلدل ہے کیچڑ ہے،
فضا میں گندگی ہے
اُس طرف کا ایک حصّہ
شہر میں جو جانور مرتا ہے
اس کی کھال الگ کرنے کے کام آنے لگا ہے
گِدھ، کتّوں اور کوّوں کو
بہت بھانے لگا ہے

درمیاں، اب بھی کہیں کچھ ہے
کہ جو کائی کے نیچے سگبگاتا سا

مٹی کی تہیں

شہر کا تالاب، جانے کب بھرے گا
نہر کا پانی سُنا ہے دے رہے ہیں
نہر کا پانی مگر آنے سے پہلے ہی کہیں یہ
گندگی سے بھر نہ جائے
زندہ رہنے کی بجائے مر نہ جائے

اب یہاں جو بھی دکھائی دے رہا ہے
سب یہاں ایسا نہیں تھا
یہ وہی تالاب ہے، جس میں کبھی
ہر صبح کتنے ہی کنول کھلتے رہے ہیں
دھوپ، جاڑا، آسماں، تازہ ہوا
باہیں پسارے، اس جگہ ملتے رہے ہیں۔

شاعری

مَیں جب جب
اپنے اندر کی آنکھیں کھول رہا ہوتا ہوں
چاروں اور مجھے بس ایک اُسی کا نام
نظر آتا ہے
نہیں چاہتا کچھ بھی کہنا
لیکن ایک عجب کیفیت
سانس سانس اظہارِ تعلق
یادیں، آنسو، لوگ، زمیں، آکاش، ستارے
جیسے کوئی بحرِ فنا میں
عالم عالم ہاتھ پسارے
اور مدد کے لیے پکارے
اور وہ سب جو، تنہا پیچھے چھوٹ چکا ہوتا ہے
یا آگے آنے والا ہوتا ہے
جانے کیسے؟ سناٹے کی دیواروں کو توڑ کے
اپنے آپ زباں میں ڈھل جاتا ہے
دُور اندھیرے کی گھاٹی میں
ایک دیا سا جل جاتا ہے۔

یونہی آبا کی انگلی تھام کر
پُرانے موسموں کی یاد کو تھامے ہوئے ہے۔

کوئی کہتا ہے، اسے مرگھٹ سے جوڑا جا رہا ہے۔
اور کوئی گھاٹ کے بارے میں کہتا ہے
کہ توڑا جا رہا ہے
کچھ کا کہنا ہے، کہ جب چاروں طرف
یہ گندگی سے بھر اٹھے تو،
ایک دو مٹی کی ہلکی سی تہیں دے کر
اسے اک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیں
یا اگر سرکار کو منظور ہو تو،
اس جگہ کو بیچ ڈالیں
تاکہ، لوگ اپنے لیے
اس شہر میں کچھ گھر بنا لیں
شہر کا تالاب جانے کب بھرے گا؟

جُرعہ جُرعہ موت

تم جو کہتے ہو کہ طوفاں تھم چکا ہے
عین طوفاں میں گھرے انساں کا
ایسا سوچنا ہمت ہے، لیکن
تم جو ساحل پر کھڑے ہو
دُور ہی سے ڈوبتی کشتی کو دیکھے جا رہے ہو
تم تو اس کے ناخدا تھے
تم یہاں ساحل پہ کیسے آ گئے ہو؟
اس پہ کہتے ہو کہ طوفاں تھم چکا ہے۔
اور اگر، سب واقعی یوں ہے
تو اتنا بھی سمجھ لو!
تم یہاں ساحل پہ ہو کر بھی
اسی کشتی کے اندر جی رہے ہو
ڈوبنے والے کی ہر آواز کا دکھ
جرعہ جرعہ پی رہے ہو۔

خوف کا نوحہ

لفظ کے ناخن جب اُگ آئے
تو اس نے
میری آنکھوں میں اُتر کر
خوف کے پنجے گڑوائے
بات یوں روز ازل کی ہے، مگر شاید
ابھی میں سو رہا تھا
مجھ میں جو تازہ لہو تھا
اس نے اپنے ناخنوں میں بھر لیا تھا

اور اب میں
جاگنے پر، چاہے جتنا چھٹپٹاؤں
آنکھ بھر لاؤں
کہ اپنی روح کا پردہ اُدھیڑوں
دھجیاں الفاظ میں تبدیل ہو کر ہی رہیں گی
ہاں مگر امکانِ جاں کے راستے پر
خوف کا نوحہ سدا لکھتی رہیں گی۔

یوگی

جو سوچتا ہے، وہ بھوگتا ہے
جو سوچتا ہی نہیں اُسے بھوگنا بھی کیا ہے؟

میں سوچتا ہوں۔
مگر میں جو سوچتا ہوں وہ بھوگتا نہیں ہوں
کہ میری ہر سوچ
"دو طرف سے دسوں دشاؤں مُڑی ہوئی ہے
"یہیں" سے "ہے" تک جُڑی ہوئی ہے۔

اَمِیرِ غَرِیب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے ——— جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے جہنم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

اَمِیرِ غَرِیب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے ـــــ جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے جہنم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

اَمیرِ غریب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے ——— جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے جہنم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

تیسّوی بَیل

سینگ دایاں ہو کہ بایاں
بیل کو تو، جس کسی صورت
زمیں کو سر اونچے تھامنا ہے
کچھ کبھی گردن ہلانے کی اگر فرصت ملی بھی
تو زمیں پر زلزلہ، سیلاب، طوفاں
کیا نہ آیا
اور پھر کچھ آسمانی دیوتاؤں نے
اسے آکر ڈرایا
"یوں نہ ہونا! یوں نہ کرنا!
اپنی ہر حرکت سے ڈرنا!
ورنہ اس دھرتی کے باشندوں کی روحیں
چیخ کر تجھ سے لپٹ جائیں گی
جن کی بددعا سے ——— تا ابد
تجھ کو جہنم کی سُلگتی آگ میں جلنا پڑے

تب سے وہ اک سینگ پر
دم بخود سیدھا کھڑا ہے
بیل گویا دُوں نہیں تو یوں جہنم میں

لاانتہا

زندگی میں جو بھی کچھ ہے
یا تو وہ تیرے تعلق سے بنا ہے
یا فقط تیرے لیے ہے
اور جو کچھ بھی نہیں ہے
وہ تیرا اور اس کا تو
ہر دم احاطہ سا کیے ہے
کیونکہ، تو
اس کچھ نہیں ہی کی وساطت سے
ہمیشہ ہر کہیں لاانتہا ہے
اور ایسے میں کوئی مجھ سا
بھلا کیسے سمجھ پائے
کہ تو کیسا خدا ہے۔

ہرگز یقیں کا مل نہ لاؤ گے

اگرچہ لاتعلق ہوں
مگر میں جو کہ خود ان کی زباں میں
بات کرتا ہوں
کہیں اُن سے زیادہ
تم پہ مرتا ہوں
مَیں تم سے چاہتا ہُوں
تم انھیں میری طرح دیکھو!
کہ جو مجھ کو ہمیشہ کچھ نہیں کہتے ہوئے
میرے علاوہ اور کچھ ہونے کی
نیت سے پریشاں ہیں۔
مگر کم جانتے ہیں
خود انھیں کی بات ہی
ان کے لیے دیوارِ زنداں ہے۔

دیوارِ زنداں

مرے بارے میں تم لوگوں سے پوچھو گے
تو وہ تم سے کہیں گے
"ہاں! سنا کرتے تو تھے کچھ تھا،
مگر ہم نے تو اس کو
ہر کہیں مفقود پایا ہے۔
کبھی دیکھا بھی ہے یا آزمایا ہے۔
وہ
کچھ بھی نہیں ہوتے ہوئے بھی ہاتھ آیا ہے۔
بس اب وہ کہیں کچھ بھی نہیں
تم نے ہزاروں بار شانت کر دکھایا ہے۔"

تم اس کی بات سن کر چونک جاؤ گے
تو میری ذات پر

اب ایسے میں
اگر تم سے کوئی پوچھے!
"سوا اک لذتِ درد نہاں تم کس کے واقف ہو؟"
تو شاید رو پڑو ـــــ یا
اندر اندر ٹوٹ جاؤ گے
مگر اپنا کوئی آنسو تو دامن تک نہ لاؤ گے
کہ میں جو ہر کہیں
موجود و نا موجود رہتا ہوں۔
فقط ایسے ہی عالم کے لیے
ہر آنکھ سے مفقود رہتا ہوں
تمھارے آنسوؤں کو
درمیاں سے جذب کر کے جا چکا ہوں گا
تمھارے آئینے کو
صاف رکھنے کی غرض سے
مجھ کو جو کہنا تھا سب سمجھا چکا ہوں گا۔

شہر، آئینہ، تم اور میں

تمھیں اپنے علاوہ شہر میں
جب کوئی شے اچھی نہیں لگتی
تمھیں جب کوئی شے اچھی نہیں لگتی
تو میں تم ہے
تمھارے آئینے کی بات کہتا ہوں
کہ ہر موجود اس کے پاس رہتا ہوں

مگر تم ہو کہ اپنے آئینے کو بھی،
اُٹھا کر، بھیڑ کے چہرے سے
اکثر توڑ دیتے ہو
مرے خدوخال بے معنی بنا کر چھوڑ دیتے ہو

تنبیہ

تو نہ چاہے بھی تو سب اُس کو خبر ہے
آدمی کا زندہ رہنا
اس کی نظروں میں ہمیشہ معتبر ہے
پھر تجھے کس بات کا دُنیا میں ڈر ہے
کاش! لیکن
اب ترے ہاتھوں نہ ہو سرزد
کبھی کوئی گناہ
بعد میں جا کر کہیں
تجھ کو جو کر ڈالے تباہ۔

نقشِ دوام

میں ترے نقشِ قدم کو
جب کبھی آئینہ صورت دیکھتا ہوں
راستہ معبد نظر آتا ہے مجھ کو
بند پلکوں پر لرزتے آنسوؤں سے نام پاکر
وقت تب دنیا میں دہراتا ہے مجھ کو
اور میں تیرے دید کی دولت سے مالا مال
خود اس کو لٹانے،
پوری دنیا میں، اکیلا
بے تحاشا بھاگتا ہوں
میں ترا نقشِ قدم بن کر
زمیں پر جاگتا ہوں۔

اِمکانِ جاں

بہت گہرے اُتر آئے ہو
اس اندھی گپھا میں
اور اب واپس بھی جانا ہے
مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی
اس آگ کا کوئی ٹھکانہ ہے

تم! اپنے آپ کو!
اپنے کسی نقشِ قدم کے
خوبصورت لاصدا احساس تک لاؤ!
نگاہوں کو بچاؤ!
آگ سے باہر نکل جاؤ!

ریل مسافت میں

آپ جو کچھ جانتے ہیں
سامنے والا بھی ممکن ہے
وہ سب کچھ پا کر اس سے بھی زیادہ جانتا ہو
اور اس نے
آپ کے لہجے سے، لفظوں سے،
انا کے آئینے میں،
آپ کی پوری کی پوری شخصیت کو
پڑھ لیا ہو
اور چپ بیٹھا ہوا ہو۔

اِمکانِ جاں

بہت گہرے اُتر آئے ہو
اس اندھی گپھا میں
اور اب واپس بھی جانا ہے
مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی
اس آگ کا کوئی ٹھکانہ ہے

تم اپنے آپ کو!
اپنے کسی نقشِ قدم کے
خوبصورت روحِ احساس تک لاؤ!
نگاہوں کو بچاؤ!
آگ سے باہر نکل جاؤ!

ریل مسافت میں

آپ جو کچھ جانتے ہیں
سامنے والا بھی ممکن ہے
وہ سب کچھ یا کہ اس سے بھی زیادہ جانتا ہو
اور اس نے
آپ کے لہجے سے، لفظوں سے،
انا کے آئینے میں،
آپ کی پوری کی پوری شخصیت کو
پڑھ لیا ہو
اور چپ بیٹھا ہوا ہو۔

اور تب دونوں جہاں کے پھول
سانسوں میں کھلیں گے

خواب اندر خواب کی سی کیفیت میں،
بس کہ اک ناگفتہ بہ احساس ہی تو معتبر ہے
زندگی کی اس شکست و ریخت سے ورنہ
کسے حاصل مفر ہے؟

آرزو کی بستیوں میں
خواہشوں کی سب تہوں کو
دُور تک کھولا ہے ہم نے
منزلِ حق میں خودی کو جان پر تولا ہے ہم نے
اور اگر سچ پوچھیے تو
اپنے ہونے یا نہ ہونے کا ہمیں
اب غم نہیں ہے۔
جانتے ہیں، وقت کے ہاتھوں ہمیشہ
کچھ بھی مستحکم نہیں ہے۔

خیالِ رفتگاں

وہ جو مستحکم نہیں ہیں
بہتے پانی پر لکیروں کی طرح آنا ہے جن کا
دھوپ میں بادل کے ٹکڑوں سا بکھر جانا ہے جن کا
عکس جن کے کچھ بھی چھو جانے سے
بس میلے ہوئے ہیں
رنگ جن کے آج بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں
خوشبوئیں جن کے تعاقب میں سدا
باہیں پسارے گھومتی ہیں
موسموں کی دیویاں جن کے پروں کو چومتی ہیں
تم انھیں خوابوں کی منزل میں کہیں دیکھو؟
تو کہنا!
ایک دن اب ہم
خود اُن سے آملیں گے۔

شاید کوئی چیز گری تھی، بے پکڑنے
نیچے اوپر، ادھر ادھر سے
لوگ پھر بھی بھوک بنے تھے
کوئی فرق نہیں تھا دونوں میں
یہ بس دیکھا دیکھی کو دوڑا تھا
دشمن کے چھونے سے پہلے ہی نے
جان سکی تھیں
تین آوازیں
اک کھٹکا ہی ——— ایک چیخ اور ایک شعلہ۔

پانی کی گہرائی کا کیا اندازہ تھا؟
میں جیسے ہی نیچے آیا!
میں نے پایا!!
دور دور تک تل کا کہیں نشان نہیں ہے
پاؤں سہارے کو کوئی پتھر
کوئی چٹان نہیں ہے۔

تبھی پہنچنے کا خیال جب دل میں آیا!
میں گھبرایا
(دم گھٹتا ہے!)
سانس سانس میں اوپر کو بڑھتا آتا ہوں
سمندر کو بھی لیکن
ساتھ ساتھ بڑھتا پاتا ہوں
جانے اس پانی سے باہر کب آؤں گا؟
اور اس عالیشان عمارت میں

خود پسند کچھوا

جون کی تپتی ہوئی اس دوپہر میں
جانے کس نے؟
مجھ کو میری پیٹھ پر الٹا دیا ہے
یہ زمیں بستر،

پھر کب واپس جاؤں گا؟
خوف یہی ہے،
میرے ساتھ سمندر بھی
چونکی ویرا اٹھتا آیا تو
اس کھنڈری کا کیا ہوگا؟

کاش! میں ان مچھلیوں سے
صرف سیدھے تیرنے کے سوا
کچھ سیکھ پاتا!
جون کی تپتی ہوئی اس دوپہر میں
اس جہاں سے یوں نہ جاتا!

کہ اک جلتی چتا ہے!
سامنے گزبھر کی دُوری پر کھڑا تالاب
مجھ پر ہنس رہا ہے
گرم لُو کا ذرّہ ذرّہ
جسم و جاں کو ڈس رہا ہے

مچھلیاں روشن خیالوں سی
مرے پیراہنِ احساس کو چھُو کر کبھی گذریں
مگر میں تو حصارِ ذات سے باہر نہ آیا
اور نہ ان کو اپنے اندر ہی بلایا

میں کہ سردی کے دنوں میں
دھوپ سے اپنی انا کا ساتھ پانے کے لیے
ان مچھلیوں سے دُور بھاگا
ایک ہی پانی میں رہ کر
آج تک ہرگز نہ ان کے ساتھ سویا
اور نہ جاگا
اور اب میں چاہے جتنا چھٹپٹاؤں
تو کھ اشکوں میں نہاؤں
خود بخود تالاب تو
چل کر نہ آئے گا یہاں تک
یہ زمین و آسماں
مجھ کو بچائیں گے کہاں تک؟

[illegible]
[illegible]
[illegible]

سَسِی فَس کے بَعد

رات کے گہرے سناٹے میں
اکثر نیند اچٹ جاتی ہے
دھندلا وہ چہرہ جس کے نیچے میں دب کر
[illegible] رہ جاتا ہوں

تَرکِ وَفا

مجھے تو کوئی ایسی جلدی نہیں ہے
مگر تم جو جاؤ؟
تو مجھ کو بس اپنا پتہ لکھ کے دے دو!
کہ شاید نگاہوں کے ان راستوں پر،
جہاں ہم کھڑے ہیں
کبھی پھر ملیں ہم!
مجھے تو کوئی ایسی جلدی نہیں ہے
جو جانا ہی چاہو
تو مجھ کو بس اپنا پتہ لکھ کے دے دو!

جو میری دونوں آنکھوں کو
گنگا جمنا کر جاتا ہے
دُکھ کا وہ پہاڑ چُپ چاپ دُھواں ہو کر تب
دُور اندھیرے کے
اُس پار اُتر جاتا ہے۔

گھنے جنگل کے ہر اک خوبصورت
جانور کو بھوت سا بن کر ڈراتا ہے
مجھے آواز سے اپنی لبھاتا ہے۔
میں اس کا سامنا کیسے کروں؟
کوئی تو بتلائے؟
کہ سورج کے سبھی رنگوں میں
آپس کا تعصب
مجھ کو سمجھائے
کہ آخر میں نہ کوئی پنچھی ہوں
ہرگز نہ پتہ ہوں
سنہری آنکھ کے لمبے سفر کا
ایک معمولی سا رستہ ہوں۔

مور

مرے دل میں، کسی اُمید کی
ہلکی سی،
کوئی بھی کرن
جب جگمگاتی ہے۔
تو میں خود کو پا فشاں جان لیتا ہوں
گھنے جنگل کے سینے میں نہاں
تازہ درختاں کونپلوں کے رُوپ میں
دُھلتی ہوئی اک آگ کو
پہچان لیتا ہوں
مگر
یہ رات کالی ہے
تو کالے پیڑ کی
نیچی کسی شاخ پر بیٹھا

گھنے جنگل کے ہر اک خوبصورت
جانور کو، بھوت سا بن کر ڈراتا ہے
مجھے آواز سے اپنی لبھاتا ہے۔
میں اس کا سامنا کیسے کروں؟
کوئی تو بتلائے؟
کہ سورج کے سبھی رنگوں میں
آپس کا تعصب
مجھ کو سمجھائے
کہ آخر میں نہ کوئی پھول ہوں
ہرگز، نہ پتہ ہوں
سنہری آنکھ کے لمبے سفر کا
ایک معمولی سا رستہ ہوں۔

مور

مرے دل میں کسی اُمید کی
ہلکی سی،
کوئی بھی کرن
جب جگمگاتی ہے۔
تو میں خود کو پا فشاں جان لیتا ہوں
مجھے جنگل کے سینے میں نہاں
تازہ درختاں کو پیلوں کے روپ میں
ڈھلتی ہوئی اک آگ کو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مری پہچان غائب ہے
میں جاؤں؟
لوٹ جاؤں؟
تو سُنا میرا مقدر ہے۔
مگر اے کاش!
بس اک بار وہ
آنکھیں اُٹھا کر دیکھ لے
اور صرف اتنا پوچھ لے مجھ سے
"تم آئے ہو؟"
کہ پچھلی مرتبہ اس نے کہا تھا
"تم ضرور آنا!"

میں آیا

بچھڑتے وقت
پچھلی مرتبہ اس نے کہا تھا
"تم ضرور آنا!"
کہا تھا "وقت ملتے ہی ضرور آنا!"
میں آیا
کس طرح آیا؟
نہ جانے کس طرح آیا؟
مگر — اب
اس کی آنکھوں سے

ماں! ہمارا خون پانی ہو چلا ہے!
یہ دوزخ، سر بسر، جیسے کہ
سب جیون کہانی ہو چلا ہے!۔

یہ صدا اندر سے آتی ہے
کہ یہ دُنیا ہمیں پیہم
بہت گہرے اندھیروں میں
کہیں دفنا رہی ہے
دوسری آکر یہ کہتی ہے
کہ مٹی میں یہی جوشِ نمو کی پیاس تو
سورج کو بھی روزِ ازل سے
آج تک دہکا رہی ہے
ماں! ہمارا خون پانی ہو چلا ہے!

ماں! بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ
تیری کوکھ سے پتوں کی صورت
پھوٹ کر ہم پھول بن جائیں؟
ضروری ہے؟
کہ ہم پیڑوں پہ لٹکے گھونسلوں میں
ہانک دیں لا کر
کھلے آکاش کی ساری دشائیں؟
کیوں ضروری ہے؟
کہ جب بادل بہت گہرا گھرا ہو
ایک اک سورج کرن کو
چونچ میں اپنی دبا کر

کیوں؟

ماں!
یہ کیسی زندگی ہے؟
ماں! ہمیں اکثر یہ لگتا ہے
کہ اب تیرے سوا، جیسے
کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔
پیڑھ کی ہڈی سے لے کر
گردنوں تک
صاف جیسے گردنوں تک،
تن میں پھیلے ہوئے رومال جیسا
یہ اپنی آنکھیں
وہ نہ اب شاید کہیں کچھ بھی نہیں ہے

شبِ غم

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ سو جاؤں!
کہ جیسے

ناچتے جائیں، ہم اپنی ہی صدا کے
درد کی اندھی گپھائیں؟

سچ بتانا ماں!
ہمارا پیٹ تیرے پیٹ سے
کیسے جُڑا ہے؟
کیوں جُڑا ہے؟
کیوں؟ . . .

شبِ غم

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ سو جاؤں!
کہ جیسے

ناچتے جائیں، ہم اپنی ہی صدا کے
دَرد کی اندھی گھٹائیں؟

سچ بتانا ماں!
ہمارا پیٹ تیرے پیٹ سے
کیسے جُڑا ہے؟
کیوں جُڑا ہے؟
کیوں؟ . . .

جہاں جو خواب ڈھلتا ہو
مجسّم خواب صورت ہو
مگر
تنہائی کے اس دشت کی
یہ لپلپاتی آگ
جو احساس کے ہر پھول کو
چپ چاپ ڈستی ہے
مجھے گھیرے کھڑی ہے
اور سورج کی سہانی دھوپ کو
پتوں پہ پھیلی اوس میں ڈھل کر
پسپا سی ترستی ہے
مرا جی چاہا .....

.....

مرا جی چاہتا ہے
آج میں کچھ بھی نہ دیکھوں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ
اُف! دیکھو! سنو! تم کون ہو؟
جو اس طرح چپکے سے آئے ہو؟
کہ میری نیند اچٹ کر رہ گئی ہے
اور، میری آنکھیں!
نہ جلتی ہیں نہ روتی ہیں
فقط دن رات جلتی ہیں

بھوک کے مارے ہوئے، کتنے ہی بچے
آئے دن اس شہر کی سڑکوں پہ سوتے ہیں

نہ جانے کیوں، مجھے اکثر یہ لگتا ہے
کہ میں اک دودھ مُنہا بچہ ہوں، جس کی ماں
یہیں شاید کسی فٹ پاتھ پر
اپنا سبھی کچھ بیچ آئی ہے
مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
مگر اس شہر کی دیوار،
جو تلوار کی صورت مری گردن پہ لٹکی ہے
اُسے توڑے بنا
فٹ پاتھ کی یہ زندگی، کیسے بسر ہوگی؟
مری مٹھی میں
یہ دن رات کی پھیلی ہوئی چادر
کہیں آ کر تو آخر مختصر ہوگی!

مرا جی چا . . . . .
. . . . . .

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ پہنوں
صرف چپکے سے نکل جاؤں!
نکل جاؤں کہیں ایسی جگہ

آدمی کے ساتھ چلتے ہیں
مرے اندر کسی بدنام خواہش کی طرح
دن رات پلتے ہیں
مگر ــــ میں جانتا ہوں!
خواہشوں کا یہ انوکھا جال
جو میرا بچھونا ہے
مجھے اس کے سوا بھی تو کہیں کچھ اور ہونا ہے!
مرا جی چاہتا ہے،
آج ... میں .....!

نہ جانے کیوں مجھے اکثر یہ لگتا ہے
مری آنکھوں میں اب آنسو نہیں
آکاش کے دھندلے ستارے ہیں
جو میری روح میں
ٹوٹے ہوئے کچھ کانچ کے ٹکڑوں کی صورت
جھلملاتے ہیں
بدن میں ریشمی دھاگوں سے تن کر
اینٹھتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، سرسراتے ہیں
کسی خونیں ہیولے سا،
مجھے میرے لہو کی دھار پر نچاتے ہیں
مرا جی چاہا .....

.....

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ لکھوں۔
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ، جیسے
انگلیوں سے اب قلم کا ساتھ چھوٹا ہو
کہ جیسے اک مجرد لفظ کو
چھونے کی کوشش میں
کہیں اک ناتواں سا ہاتھ ٹوٹا ہو۔
نہ جانے کیوں مجھے اکثر یہ لگتا ہے
کہ جیسے وہ مجرد لفظ اور
وہ ناتواں سا ہاتھ
جو وہ ازل سے

آدمی کے ساتھ چلتے ہیں
میرے اندر کسی بدنام خواہش کی طرح
دن رات پلتے ہیں
مگر ــــ میں جانتا ہوں!
خواہشوں کا یہ انوکھا جال
جو میرا بچھونا ہے
مجھے اس کے سوا بھی تو کہیں کچھ اور ہونا ہے!
میرا جی چاہتا ہے،
آج ... میں .....!

سَرد رَو

سرد رَو،
پچھلے کئی دِن سے
شمالی ہند کو گھیرے ہوئے ہے
سوچتا ہوں
وہ شمالی ہند ہو یا خطۂ سلطان کا
چھوٹا سا اک تنہا جزیرہ
ایک دن یہ سرد رو
چمنِ زیں کو نگلے گی

اور ہم سب
دھوپ میں جھلسے ہوئے چہرے اُٹھائے،
برف پڑنے کی دعائیں مانگ کر
خوش ہوں گے۔

میں ابھی کچھ دیر پہلے
شہر کی سڑکوں پہ آوارہ بھٹکتا پھر رہا تھا۔
میں نے دیکھا
نصف شب کا چاند
جانے کس جگہ جا کر چھپا ہے؟
قمقموں کا شہر اندھا ہو گیا ہے۔
شہر کا ماحول، جنگل کی فضا، سب
ایک بھوری دھند میں لپٹے ہوئے ہیں
آسماں حدِ نظر تک منجمد ہے
سایا سایا دم بخود ہے
صرف کچھ زنّاٹے چیخیں ہیں
جو رہ رہ کر فضا میں گونجتی ہیں
کھڑکیاں سہمیں جنہیں سن کر
ستاروں کو سیاہی بانٹتی ہیں
حبس برفانی علاقوں کا
نشیبوں میں اتر کر رینگتا ہے
تم ہوا کا ذائقہ چکھنے سے پہلے
اپنے اندر خون کی مقدار جانچو!
نبض کی رفتار تو بے شک وہی ہے
دل دھڑکنے کا مگر انداز پاؤ گے
کہ پہلے سے جدا ہے

رات اب بھی دو پہر باقی ہے لیکن
بند کمروں کے سب آتش دان خالی ہو چکے ہیں

سَرْدَرُو

سردرو،
پچھلے کئی دن سے
شمال ہند کو گھیرے ہوئے ہے
سوچتا ہوں
وہ شمال ہند ہو یا خطۂ سلطان کا
چھوٹا سا اک تنہا جزیرہ
ایک دن یہ سردرو
[illegible]
[illegible]
دھیرے دھیرے [illegible]
[illegible]
[illegible]

جو ایک بے ہنگم خلا ہے
کیا کوئی بھی ہاتھ اُسے پُر کر سکے گا؟

سر درد کا
ریڑھ کی ہڈی سے جب
سیدھا سا رشتہ ہو
تو پھر ہذیان گوئی کیا کرے گی؟

اب وہاں مردہ ہوا کا خول ہے۔
یا آگ کا بے جان پہر

سرد بستر
میرے ہر موئے بدن میں
زہر سا بونے لگا ہے
جسم جیسے ریشہ ریشہ ٹوٹ جانے پر تُلا ہے
ذہن میں اُڑتی ہوئی چنگاریوں کا شور سا ہے
اندر! اندر!
ایک لامحدود گہرائی کی خندق
مجھ پہ مُنہ بائے کھڑی ہے!
بات جو میں نے اُٹھائی تھی
وہ مجھ سے بھی بڑی ہے؟

میرے بائیں پیر کا سب سے بڑا ناخن
کسی ٹھوکر سے کاٹا پڑ گیا ہے
میری دائیں آنکھ سے
رَوزَہ کے پانی رِس رہا ہے
ناخنوں میں ریت کے ذرّے چمکتے ہیں
مگر پانی کہاں ہے؟
سوچتا ہوں
کیا فقط تنہا کے اوراق اُلٹنے سے
ضمیر کا صفحہ بھی ہو سکتا ہے؟
نہ خوں نہ زخموں کے دریچوں

ہم ابھی شاید!
الف ب پ ہی لکھنا سیکھ پائے تھے
کہ جب اسکول میں سیلاب آیا
گاؤں کے کچے مکانوں سے نکل کر
کوئی باہر آ نہ پایا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہم سبھی کو اک نئی ترکیب سوجھی
پیڑ پر بستے اٹھائے
تختیاں سینوں سے چپکائے
گلی کے موڑ تک ہم تیر آئے
دم بہ دم اسکول کی گرتی ہوئی چھت
ہم کو واپس لوٹ آنے کے اشارے
کر رہی تھی
ہم نے پل بھر کے لیے سوچا
مگر تب دفعتاً
آکاش سناٹے میں گونجا!
چوندھیاتی آنکھ سے ہم
ایک دوجے کے لیے لپکے ——
مگر سب کھو چکا تھا
ہر کوئی چپ چاپ اکیلا ہو چکا تھا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہوش آنے پر سبھی نے

الف ب پ

نیلگوں پتھریلی سلیٹوں پر
غزالوں کی طرح آنکھیں ٹکائے
ہم لکیریں کھینچتے
آپس میں کچھ بتیا رہے تھے
ماحصل، کن کن لکیروں کا،
کہاں کس حرف میں کتنا گھنا ہے
بس یہی چنچل پرندوں کی ادائیں
بول کر سمجھا رہے تھے
اُس گھڑی، استاد صاحب پر
غزل اتری ہوئی تھی
آسماں پر بادلوں کے جھنڈ فوٹے کھا رہے تھے۔

تاگڑی، تعویذ، قشقہ، کیس، پگڑی
یا جنیو کو ہی سنت مانتے ہیں

زندگی گزری، مگر لگتا ہے جیسے
آج بھی ہم اپنی اپنی سنتوں کو
پیٹھ پر بستوں کی صورت ڈھو رہے ہیں
آج بھی اسکول کی گرتی ہوئی چھت سے
اشارے ہو رہے ہیں۔

گاؤں کی مٹی کو ماتھے سے لگایا
اور الف ب پ کے لفظوں کو
دلوں کے ساتھ سینوں میں سجا کر
اپنی اپنی ذات کا پرچم اٹھایا

گو کہ اس کے بعد ہم
اپنی وراثت کھو چکے تھے
ہم جماعت ساتھیوں کے نام لیکن
دوسری جگہوں پہ روشن ہو چکے تھے۔

درحقیقت!
اس الف ب پ سے آگے
آج تک جو کچھ کہیں لکھا، پڑھا ہم نے
کہ سیکھا یا کہا
سب کھیل سا تھا۔
آئینہ ادراک کے چہرے ہی سے
بے میل سا تھا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہم کہیں بھی ہوں۔
مگر اندر سے ہم سب،
کس قدر یکجان ہیں،
یہ وہی پہچانتے ہیں
لوگ تو کثرت ہمارے،

نقشِ فریادی

میرا اندھا سہور اور میں

دیکھو! دیکھو!
پھر وہ میرے سامنے ہے
پھر میرے اندر کہیں تیزاب سا گھلنے لگا ہے
پھر میں اپنے ہی لہو کی دھار پر بہنے لگا ہوں
اور اس کی ہر اذیت،
بھیشم کی صورت کسی کالے مہابھارت کے
تیروں پر پڑا سہنے لگا ہوں۔

میں کہ جو ہندوستاں ہوں
میں کہ جو ہندوستاں کی خاک سے اُپجا ہوا
اک نامکمل نقش سا ہوں
میں کہ جو شاید کہیں کچھ بھی نہیں ہوں۔

وہ جو ہم سے دُور ہے تو
یہ جو اندر سے ہمیں تقسیم کرنے میں لگا ہے،
کون ہے یہ؟
اور اگر یہ وہ نہیں تو وہ کہاں ہے؟
جس جگہ ہم بیٹھ کر
اپنے حصارِ ذات سے اُلجھے ہوئے ہیں،
یہ کوئی گنبد ہے، روزن ہے،
کہ روشن آسماں ہے
یا فقط خواہش زدہ مٹی کا
اک خالی مکاں ہے؟

یا کہیں ایسا نہ ہو وہ آ چکا ہو؟
اور ہمیں اپنی طلسمی تیغ سے
تقسیم کر کے جا چکا ہو!

نقشِ فریادی

میرا اللہ اسبوہ

اور میں

وہ جو ہم سے دُور ہے تو
یہ جو اندر سے ہمیں تقسیم کرنے میں لگا ہے،
کون ہے یہ؟
اور اگر یہ وہ نہیں تو وہ کہاں ہے؟
جس جگہ ہم بیٹھ کر
اپنے حصارِ ذات سے اُلجھے ہوئے ہیں،
یہ کوئی گنبد ہے، روزن ہے،
کہ روشن آسماں ہے
یا فقط خواہش زدہ مٹی کا
اک خالی مکاں ہے؟

یا کہیں ایسا نہ ہو وہ آ چکا ہو؟
اور ہمیں اپنی طلسمی تیغ سے
تقسیم کر کے جا چکا ہو!

دانتوں کو اپنے کٹکٹا کر بھینچتا ہے،
اس کی ہر اک سانس میں
سو اژدہے پھنکارتے ہیں
سُوکھ جاتے ہیں ندی، تالاب جھرنے،
کھول اُٹھتے ہیں سمندر اور ہوائیں
سر برہنہ جنگلوں میں چیختی ہیں
چیختے ہیں پیڑ پودے، اور شاخیں،
اپنے پتوں سے گریزاں،
یوں خلا میں گھورتی ہیں،
جیسے اب اُن کے لیے کچھ بھی کہیں باقی نہیں ہے

اپنے پیلے ناخنوں سے
چیر کر سینہ کنواری خامشی کا
جب یہ اس کے خون سے اپنے بدن کو سینچتا ہے
کانپ اُٹھتی ہیں فضائیں
کٹ کے اپنے آپ سے جانے کدھر کو
بھاگنے لگتی ہیں آدھ ننگی دِشائیں
اور ہمالہ
برف کے ٹھنڈے لحافوں میں دُبک کر
ہانپتا ہے،
"جاؤ! جاؤ!
دُھوپ، سورج، گُل مہر، آکاش!
سب جاؤ یہاں سے
سب چلے جاؤ یہاں سے!"

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
دھرتی ماں کی کوکھ کا ناسور
میرے ساتھ جب پیدا ہوا تھا
آسماں کا رنگ
اُسی دن ہی تو نیلا پڑ گیا تھا

مَیں فقط نو سال کا تھا
جب ہمارے گاؤں پر پہلے پہل
یہ بدنما آسیب اُترا۔
اور مَیں اپنے ہم جماعت ساتھیوں،
احمد، لیاقت، فاطمہ، اقبال کو
خورشید کو بھی
مینہہ برستے بھیگتی پگڈنڈیوں پر چھوڑ کر
جانے کہاں کو چل دیا تھا
مُڑ کے دیکھا تھا تو اس عفریت کے
پیروں تلے تھا۔
خون میں تبدیل ہوتا۔
پانچ دریاؤں کا پُر آشوب پانی
جو خود اپنے آپ پر تقسیم ہو کر
منفی و مثبت کے چکر میں پھنسا تھا
آج تک گویا کہ ویسے ہی پھنسا ہے۔

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
تو کہیں تو یہ میرا ہمزاد بھی ہے
[illegible] کوشش کو [illegible] ہوا

دانتوں کو اپنے کٹکٹا کر بھینچتا ہے،
اس کی ہر اک سانس میں
سو اژدہے پھنکارتے ہیں
سُوکھ جاتے ہیں ندی، تالاب جھرنے،
کھول اُٹھتے ہیں سمندر اور ہوائیں
سر برہنہ جنگلوں میں چیختی ہیں
چیختے ہیں پیڑ پودے، اور شاخیں،
اپنے پتوں سے گریزاں،
یوں خلا میں گھورتی ہیں،
جیسے اب اُن کے لیے کچھ بھی کہیں باقی نہیں ہے

اپنے پیلے ناخنوں سے
چیر کر سینہ کنواری خامشی کا
جب یہ اس کے خون سے اپنے بدن کو سینچتا ہے
کانپ اُٹھتی ہیں فضائیں
کٹ کے اپنے آپ سے جانے کدھر کو
بھاگنے لگتی ہیں اَدھ ننگی دِشائیں
اور ہمالہ
برف کے ٹھنڈے لحافوں میں دُبک کر
ہانپتا ہے،
"جاؤ! جاؤ!
دُھوپ، سورج، گُل مہر، آکاش!
سب جاؤ یہاں سے
سب چلے جاؤ یہاں سے!"

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
دھرتی ماں کی کوکھ کا ناسُور
میرے ساتھ جب پیدا ہوا تھا
آسماں کا رنگ
اُسی دن ہی تو نیلا پڑ گیا تھا

مَیں فقط نو سال کا تھا
جب ہمارے گاؤں پر پہلے پہل
یہ بدنما آسیب اُترا۔
اور مَیں اپنے ہم جماعت ساتھیوں،
احمد، لیاقت، فاطمہ، اقبال کو
خورشید کو بھی
مینہ برستے بھیگتی پگڈنڈیوں پر چھوڑ کر
جانے کہاں کو چل دیا تھا
مُڑ کے دیکھا تھا تو اس غربت کے
پیروں تلے تھا۔
خون میں تبدیل ہوتا،
پانچ دریاؤں کا پُر آشوب پانی
جو خود اپنے آپ پر تقسیم ہو کر
منفی و مثبت کے چکر میں پھنسا تھا
آج تک گویا کہ ویسے ہی پھنسا ہے۔

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
جو کہیں شاید میرا ہمزاد بھی ہے
جو ہی آکاش کو جب گالیاں دیتا ہوا

چکرویوہ

دوست میرے
کرشن کا مانا کہ تم نے نام سُن رکھا ہے لیکن
کنس تو کوئی کبھی مارا نہیں ہے
اور نہ تم نے،
دروپدی کی لاج لٹنے سے بچایا
پوتنا دائی، بکاسُر اور کالی ناگ کے
قصّوں کا بھی گیتا سے گہرے میں تعلق ہے
کسی نے آج تک تم کو بتایا؟

جس کو دریودھن سمجھتے ہو
کبھی اس کے گھر بھوجن میں شرکت ہی کی
یا جھوٹے پتّل بھی اٹھائے
تین مٹھی ستّوؤں کی چاہ میں
کیا تم سداما کے کبھی نزدیک آئے؟

دیکھو! دیکھو! پھر وہ میرے سامنے ہے
پھر میں اپنے ہی لہو کی دھار پر بہنے لگا ہوں
اور پھر اس کی ہر اذیت
بھیشم کی صورت
کسی کالے مہابھارت کے تیروں پر پڑا
سہنے لگا ہوں
اور وہ میری ذات سے باہر نکل کر
پھر شمالی ہند پر چھانے لگا ہے
پھر مجھے بچپن کا وہ ننگا بھیانک
خواب یاد آنے لگا ہے۔

10621
31.3.90

ہاں اگرچہ کرشن کو تو اس پہ بھی
تم کو اکیلا دیکھ کر، رتھ سے اترنا ہی پڑے گا
اور تمھارے رتھ کا بھی
تو ذرا جو ہمت اٹھا کر
وہ تمھاری بھی حفاظت خود کرے گا
کیونکہ تم ارجن بھلے ہی بن نہ پاؤ
کرشن تو اپنوں کی خاطر
کرشن ہی بن کر لڑے گا۔

اور بھی کتنا ہی کچھ،
جو بے نہیں ہے سے پرے،
لیکن ہماری قوم کے روح و رگ و ریشہ،
زمیں کے چپے چپے سے جڑا ہے
کرشن جس کے نام سے ہے
اور جو خود کرشن کا پیغامبر ہے،
جاوداں ہے،
کیونکہ یہ ہندوستاں ہے
کرشن کا مانا کہ تم نے نام سن رکھا ہے لیکن،
دوست میرے!

اور اس پر بھی اگر
گانڈیو اٹھانے پر تلے ہو،
تو ذرا سوچو! کہ ارجن کی طرح
جس جنگ میں تم آ کھڑے ہو
ویو ہیکر۔ اس جگہ
کن اجنبی راہوں سے ہو کر آ رہا ہے
سر بکف ہو کر نکل پڑنے میں
کچھ لگتا نہیں ہے۔
کیونکہ جس کو، دیوہ کی رچنا
سمجھ میں ہی نہ آئے،
وہ مہابھارت کے پنوں پر
زیادہ سے زیادہ
ایک ابھیمنو رہے گا۔

اک تمھاری میراث ہی نہیں ہے،
ہمارا بھی نام اس کی تاریخ میں لکھا ہے

گئے وہ شاہیں
جو ہم غریبوں کو آئے دن نوچ کھا رہے تھے۔
گئے شکاری، جو نت نئے جال کے ذریعے
یہاں وہاں سب کو انگلی انگلی نچا رہے تھے۔
مگر ہماری اڑان بھرنے کی ہر سعی پر،
ہزار طرح کی بندشیں آج بھی لگی ہیں
مگر جو اک آسماں ہمارے لیے بنا تھا،
وہ رفتہ رفتہ سمٹ رہا ہے
کہ آدمی آدمی کے ہاتھوں
پتنگ بازی میں کٹ رہا ہے۔

ہمارا کیا اور ہماری پرواز کی
فضاؤں پہ دسترس کیا
مگر وہ سب لوگ جو ہمیں
امن کے پیمبر سا کہہ گئے ہیں
نہ جانے کس راہ رہ گئے ہیں
ہمارے ڈیرے بھی ان بزرگوں کے ساتھ ہی
وقت کی ندی پار بہہ گئے ہیں۔

نئی پرانی، سبھی طرح کی عمارتوں میں
ہم ان دنوں ایک ساتھ جینے کی

کبوتروں کی عرضداشت

پتنگ بازو! نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے
یہاں کی تہذیب دوستو!

اک تمھاری میراث ہی نہیں ہے،
ہمارا بھی نام اس کی تاریخ میں لکھا ہے

گئے وہ شاہیں
جو ہم غریبوں کو آئے دن نوچ کھا رہے تھے۔
گئے شکاری، جو نت نئے جال کے ذریعے
یہاں وہاں سب کو انگلی نچا رہے تھے۔
مگر ہماری اڑان بھرنے کی ہر سعی پر،
ہزار طرح کی بندشیں آج بھی لگی ہیں
مگر جو اک آسماں ہمارے لیے بنا تھا،
وہ رفتہ رفتہ سمٹ رہا ہے
کہ آدمی آدمی کے ہاتھوں
پتنگ بازی میں کٹ رہا ہے۔

ہمارا کیا اور ہماری پرواز کی
فضاؤں پہ دسترس کیا
مگر وہ سب لوگ جو ہمیں
امن کے ہمپیر سا کہہ گئے ہیں
نہ جانے کس راہ رہ گئے ہیں
ہمارے ڈیرے بھی ان بزرگوں کے ساتھ ہی
وقت کی ندی پار بہہ گئے ہیں۔

نئی پرانی، سبھی طرح کی عمارتوں میں
ہم ان دنوں ایک ساتھ جینے کی

کبوتروں کی عرضداشت

پتنگ بازو! نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے
یہاں کی تہذیب دوستو!

پتنگ بازو!
نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے۔

1

کوششوں میں لگے ہوئے ہیں
ہمارا سب رنگ و نسل کا
امتیاز بھی کب کا مٹ چکا ہے
کہ ہم فقط آدمی کے دکھ میں
اداس آنکھوں جگے ہوئے ہیں ۔

کوئی علاقہ ہو، شہر ہو، ملک یا جزیرہ،
ہمارا پیغام تو سدا
امن و آشتی تھا
ہے اور رہے گا
ہمارا ہر خواب آدمی کی
سلامتی کے لیے بنا ہے، بنا رہے گا
ہمارا جنگل سے کچھ نہیں واسطہ
اگر ہو بھی تو ہمیں علم ہے
کہ ہم کرۂ زمیں پہ
بغیر انسان کہیں بھی زندہ نہ رہ سکیں گے
ہمارے حق میں
حدوں کا جس طرح کا تعین بھی
لوگ چاہیں،
ہم ان حدوں کی خلاف ورزی،
کسی بھی صورت نہیں کریں گے ۔
تمہارے بچوں کی خیریت کی
دعائیں اپنے پروں پہ لکھ کر
ہم ہمتوں سے آج تک ہم

مجھ کو معلوم ہے تم وہی لوگ ہو

مجھ کو معلوم ہے یہ جو سڑکوں پہ بکھرا ہوا ہے لہو
یہ جو ماحول دہشت زدہ ہے یہاں
یہ جو گلیوں میں ہے سوگ چھایا ہوا
یہ جو آکاش کو چھو رہا ہے دھواں
اٹھ رہی ہیں جو لپٹیں وہاں آگ کی
یہ سبھی کچھ تمہارے کیے سے نہیں
اس کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے

لیکن اے دوستو!
تم نے سوچا ہی ہے تم نے جانا ہی ہے؟
ان سب اعمال سے، ایسے کردار سے
اپنی منزل کی جانب رواں قوم کو
تم نے لاکر کہاں سے کہاں رکھ دیا

یہ تھکن، یہ اداسی، یہ افسردگی
گرد آلود چہروں کی دھندلی فضا!
قوم کے تازہ دم ہونے کے وقت پر
تم نے یہ کیا کیا؟ تم نے یہ کیا کیا؟؟
یہ کوئی وقت تھا آپسی بیر کا؟؟؟
خیر! اب تک تو جو کچھ ہوا سو ہوا،
یاد رکھنے کی اب بس اک بات ہے،

آؤ واپس چلیں

تم وہی لوگ ہو
مجھ کو معلوم ہے، تم وہی لوگ ہو
جن کے اجداد کی شہ رگوں کا لہو
مدتوں اس گلستاں کو سینچا کیا
مدتوں کی غلامی کی زنجیر کو
جن کے اجداد نے توڑ کر رکھ دیا
تم وہی ہو کہ جن کے دلوں میں کبھی
اتحاد و اخوت کے جذبات تھے
ہر کڑے وقت پر
جو وطن کی خودی کے محافظ رہے
جن کی پیشانیوں کا پسینہ سدا
خدمتِ قوم میں صرف ہوتا رہا
جن کی سادہ دلی
جن کی زندہ دلی
ہر طرح کی سیاست سے بالا رہی
تم وہی ہو کہ جن کی لغت میں کبھی
اکثریت کوئی لفظ تھا ہی نہیں

مجھ کو معلوم ہے تم وہی لوگ ہو

مجھ کو معلوم ہے یہ جو سڑکوں پہ بکھرا ہوا ہے لہو
یہ جو ماحول دہشت زدہ ہے یہاں
یہ جو گلیوں میں ہے سوگ چھایا ہوا
یہ جو آکاش کو چھو رہا ہے دھواں
اُٹھ رہی ہیں جو لپٹیں وہاں آگ کی
یہ سبھی کچھ تمھارے کیے سے نہیں
اس کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے

لیکن اے دوستو!
تم نے سوچا ہی ہے تم نے جانا ہی ہے؟
ان سب اعمال سے، ایسے کردار سے
اپنی منزل کی جانب رواں قوم کو
تم نے لاکر کہاں سے کہاں رکھ دیا

آؤ واپس چلیں

تم وہی لوگ ہو
مجھ کو معلوم ہے، تم وہی لوگ ہو
جن کے اجداد کی شہ رگوں کا لہو
مدتوں اس گلستاں کو سینچا کیا
مدتوں کی غلامی کی زنجیر کو
جن کے اجداد نے توڑ کر رکھ دیا
تم وہی ہو کہ جن کے دلوں میں کبھی
اتحاد و اخوت کے جذبات تھے
ہر کڑے وقت پر
جو وطن کی خودی کے محافظ رہے
جن کی پیشانیوں کا پسینہ سدا
خدمتِ قوم میں صرف ہوتا رہا
جن کی سادہ دلی
جن کی زندہ دلی
ہر طرح کی سیاست سے بالا رہی
تم وہی ہو کہ جن کی لغت میں کبھی
ہر بزدلی کوئی لفظ تھا ہی نہیں

عزمِ تقدّم

یومِ جمہوریت پر اہلِ وطن کے نام

یہ عزم ہم نے کیا تھا کسی زمانے میں
ہم اپنے ملک کو جنت بنا کے دم لیں گے

اُٹھے ہیں دہر میں ہم وقت کی صدا بن کر
تمام سوئے ہوؤں کو جگا کے دم لیں گے

کوئی بھی وقت ہو، کوئی بھی دور ہو،
مُلک ہر فرقہ و فرد سے ہے بڑا،
اور اس کے علاوہ بھی اے دوستو!
آدمی تو فرشتوں کی اولاد ہے،
اس کا شیطان بننا مناسب نہیں

چوک، بازار، گلیاں، دفاتر،
سبھی شاہراہیں، دُکانیں، ملیں بے اماں،
زنگ کھاتی ہوئی ریل کی پٹریاں
کارخانوں کی دم توڑتی چمنیاں
عالم یاس میں سرگراں کھیتیاں
آدمی اور دھرتی کے پاکیزہ رشتے کی قسمیں
سروں پر اٹھائے ہوئے
ہر قدم پر صدا دے رہی ہیں تمہیں!
"آؤ، بس چلیں"
"آؤ، بس چلیں"

یہ ٹھیک ہے کہ زمانے کے ساتھ ہم نے بھی
نئی نگاہ، نئی روشنی کو پایا ہے

چراغِ علم و ہنر کا طلسم پھیلا کر
ہر ایک گوشے کو بھارت کے جگمگایا ہے

کہیں پہ ہم نے بنائے ہیں ڈیم بجلی کے
عمارتوں کو کہیں تا فلک اٹھایا ہے

ٹریکٹروں سے کہیں جوت کر زمینوں کو
ہر ایک سوئے ہوئے کھیت کو جگایا ہے

نکال کر نئی سڑکیں ہر اک بیاباں میں
تمام گاؤں کو شہروں سے جا ملایا ہے

طرح طرح کی مشینیں لگا کے شہروں میں
کئی گھروں کو نئے نور سے سجایا ہے

پڑا ہے وقت عدو کو شکست دینے کا
تو سرحدوں پہ بھی جا کر لہو بہایا ہے

زمیں پہ خلدِ بریں کی تلاش میں ہم نے
غرض کہ آگے ہی آگے قدم بڑھایا ہے

جنوں میں آج سراپا چراغ ہیں ہم لوگ،
نقاب رُخ سے سحر کے ہٹا کے دم لیں گے

ہمارے عہد میں نفرت کا کوئی کام نہیں
سبھی کو پیار سے جینا سکھا کے دم لیں گے

کوئی غریب نہ کوئی امیر ہو جس میں
ہم ایک ایسی ہی بستی بسا کے دم لیں گے

نکل پڑے ہیں اُجالوں کو ہاتھ میں لے کر
مقدروں کے اندھیروں پہ چھا کے دم لیں گے

چلے نہ تھے تو کوئی راہ تھی نہ منزل تھی
اور اب چلے ہیں تو منزل پہ جا کے دم لیں گے

ہمیں قسم ہے ہماری وطن پرستی کی
کہ مفلسی کو وطن سے مٹا کے دم لیں گے

یہ عزم ہم نے کیا تھا کسی زمانے میں

ہر آئے سال مگر آج کے مقدس روز
ہم اپنے آپ کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں
کہ اپنے حال کی ہر ناگوار صورت کو
اک اور وعدۂ فردا پہ ٹال دیتے ہیں

؟

وقت اس کیفیت میں تمھارا
لموں سے گزر ہو رہا تھا۔
نے سوچا نہ تھا سامنے سے
فق آئینہ در آئینہ
ہا تھا

روک کر کچھ کہوں
ک تیر آ کر
ں سمایا
قاتب میں بھاگا
ک کر ساتھ آیا

اری
کاری

ے رہی ہے
نہیں ؟

میسر نہ ہونا!
دریچے پڑا

06621
31. 3.90

کپل وستو کا راج

اندرا جی کی شہادت پر، راجیو گا

ڈاک طے شدہ راستے پر تھے لیکن
وقت تاریکیاں بلندی پہ اُڑنا خطرناک تھا

اور تم،
اپنی پرواز میں اس قدر مبتلا ہو چکے تھے
کہ سمتوں کی پہچان کے ساتھ ہی ساتھ
دوری کا احساس بھی کھو چکے تھے۔

بیک وقت اس کیفیت میں تمھارا
کئی عالموں سے گزر ہو رہا تھا۔
مگر تم نے سوچا نہ تھا سامنے سے
اُفق در اُفق آئینہ در آئینہ
مختصر ہو رہا تھا

تبھی مَیں تمھیں روک کر کچھ کہوں
پیشتر اس کے اک تیر آ کر
تمھارے پروں میں سمایا
شکاری تمھارے تعاقب میں بھاگا
بہت دُور تک بھاگ کر سامنے آیا
فضا میں ابھی تک
اسی تیر کی سنسناہٹ ہے طاری
کہ جس سے بندھا ہانپتا ہے شکاری
بلندی سے گرتا ہوا
قطرہ قطرہ لہو کون روکے ؟
زمیں پھر بھی شانہ بہ شانہ
تمھیں اپنے آغوش کا واسطہ دے رہی ہے
"اُتر آؤ ! اب اور اُڑنا مناسب نہیں ؟"
ہر قدم یہ صدا دے رہی ہے ،

مگر تیر کی نوک پر یوں رُکے
جان کے خوف کو تم میسّر نہ ہونا !
یہاں سے ذرا دور نیچے کھڑا

10621
31. 3.90

کپل وستو کا راج ہنس

اندرا جی کی شہادت پر، راجیو گاندھی کے نا

تم اک طے شدہ راستے پر تھے لیکن
رُکنا یکایک بلندی پہ اتنا خطرناک تھا

اور تم،
اپنی پرواز میں اس قدر مبتلا ہو چکے تھے
کہ سمتوں کی پہچان کے ساتھ ہی ساتھ
دوری کا احساس بھی کھو چکے تھے۔

دھار تھ تم کو نہیں پا سکے گا

سے تمھارے وہ جب تک

تیر کو کھینچ کر اپنے ہاتھوں نکالے

کی اس کو نظر کون دے گا ؟

دستو کا شاہزادہ بالآخر !

سے نکل کر تو گوتم بنے گا !!

10621
31 3.90